نقد و نظر

محمد اکرم خان ڈائریکٹر
کمرشل آڈٹ لاہور

"حکمتِ قرآن" (ج ۲، ش ۳، مئی ۸۳ء) کے صفحات ۲۱-۲۶ پر جناب مولانا محمد طاسین صاحب کے گراں قدر علمی مقالہ "مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام" کی تیسری قسط شائع ہوئی ہے۔ آپ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ مزارعت کا معاملہ ربوا سے مشابہ ہے۔ لہٰذا یہ حرام ہے، اس کیلئے آپ نے علاوہ متقدمین کے اقوال کے کچھ عقلی دلائل بھی دیئے ہیں۔ یہ عقلی دلائل ایسے ہیں جن سے معاملہ مکمل طور پر کھل کر سامنے نہیں آیا بلکہ کچھ اشکال بھی پیدا ہو گئے ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ جناب مولانا صاحب ان اشکالات کی تشریح بھی آئندہ بحث میں یا الگ سے فرما دیں۔

اوّل۔ مولانا فرماتے ہیں: "معاملہ ربوا کی حقیقت و ماہیت ... اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس میں ایک فریق اپنا مال دوسرے کو استعمال کے لئے بطور قرض دیتا ہے اور شرط لگاتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد اسے اس کا اصل مال مع اضافے کے واپس کرنا پڑے گا لہٰذا اس میں مقرِض یعنی قرض دینے والے کے لئے اس کا اصل مال بھی بغیر کسی نقصان کے پوری طرح محفوظ رہتا ہے ... لہٰذا ہر وہ معاشی معاملہ، معاملہ ربوا کے مماثل و مشابہ ٹھہرتا ہے جس میں ایک فریق کا مال دوسرے کے استعمال میں اس قانونی تحفظ کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ مال جب واپس ہوگا تو بغیر کسی کمی و نقصان کے پورے کا پورا واپس ہوگا اور اس کے ساتھ وہ بغیر کسی پیداوار محنت کے دوسرے سے کچھ زائد مال اس وجہ سے لیتا ہے کہ دوسرے نے اس کا مال استعمال کیا ہے۔" (ص ۳۶)

اس دور میں ربوٰ کی یہ تعریف کسی حد تک ناقابلِ قبول ہو گئی ہے پچھلے

۴۰ برسوں میں تمام دنیا میں افراطِ زر کا ایک مسلسل رجحان پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے مال کی قدر و قیمت وقت گذرنے سے کم ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ مُقرِض کو کبھی بھی اپنا اصل مال واپس نہیں ملتا بلکہ مدّتِ قرض ختم ہونے پر اُس کی اصل قدر و قیمت میں کمی آچکی ہوتی ہے۔ چنانچہ پچھلے دس برسوں میں تو دنیا میں معاملہ یوں رہا ہے کہ شرحِ سود، شرحِ افراطِ زر سے کم رہی، چنانچہ عملاً مقرِض اپنے سرمایے کا معاوضہ وصول کرنے کے بجائے اپنے سرمایے پر مقرض کو معاوضہ دیتے رہے۔ معاملہ کی یہ سیدھی سادی تشریح کہ ظاہری گنتی میں تو مُقرض کو اپنا مال پورے کا پورا ملتا ہے، معاملہ کی حقیقت کو نہیں بدل دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی تسلی کے لئے کسی منطقی موشگافی کا سہارا لے بھی لیں لیکن دنیا اس منطق سے کبھی مطمئن نہیں ہوسکتی۔

جناب مولانا نے اسی دلیل کو مزارعت کے معاملہ پر منطبق کیا ہے، فرماتے ہیں "اسی طرح معاملۂ زراعت میں مالک کے لئے زمین محفوظ رہتی اور معاملہ ختم ہونے پر پوری کی پوری اسے واپس ملتی ہے۔" (ص ۳۹)، یہ بھی معاملہ کی ظاہری حالت ہے ورنہ کس کو یہ حقیقت نہیں معلوم کہ فصل اُگنے کے بعد زمین کی پیداواری صلاحیت کم ہوجاتی ہے، چنانچہ وہ زمین جس پر پے در پے فصلیں اُگائی جائیں اور وہ زمین جس پر کبھی کاشت نہ ہوئی ہو اپنی زرخیزی میں مختلف ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں کھاد کا استعمال جس طرح بڑھ رہا ہے وہ اس بات ہی کی شہادت ہے کہ استعمال سے زمین کی زرخیزی میں فرق آجاتا ہے۔ ایسے میں یہ کہنا کہ مزارع، مالک کو زمین پوری کی پوری واپس کردیتا ہے رقبے کے اعتبار سے تو ٹھیک ہوسکتا ہے لیکن حقیقتِ معاملہ ایسی نہیں ہے۔

دوم - بیع کی حلّت پر جو دلائل جناب مولانا نے دیئے ہیں وہ بھی قابلِ غور ہیں: فرماتے ہیں: "معاملۂ بیع کو اس لئے حلال و جائز ٹھہرایا ہے کہ یہ عدل کے مطابق ہے کیونکہ اس میں فریقین آپس میں جو دیتے لیتے ہیں ایک دوسرے کا حق سمجھ کر دیتے لیتے ہیں اور اس میں ان کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے۔" (ص ۳۷)

بیع کی حلت کے لئے جو وجوہ بیان ہوئے ہیں وہ بہت حد تک ربٰو پر بھی عائد ہوتے ہیں - ساری دُنیائے مغرب میں کاروباری منافع کے لئے سرمایے پر سود دینے والے، سود کو سرمایہ دار کا حق سمجھ کر بطیب خاطر دیتے ہیں۔ حقیقی رضامندی کا تو یہ عالم ہے کہ بینکوں اور مالیاتی اداروں سے قرض لینے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور وہ سب کو مطلوب نہیں پا رہے، اگر قرض لینے والے سود دینے کو اپنے پر بار یا نارضامندی کا معاملہ سمجھتے ہوں تو بھلا وہ ان شرائط پر سرمایہ حاصل کرنے کے لئے کیوں جوق درجوق آئیں ؟ اگر باہم رضامندی ہی کسی معاملہ کو بیع بنا دے تو استحصال کے تمام معاملات ربٰو سے بیع بن جائیں اگر فریقین خوشدلی سے وہ طے کرلیں - اس طرح کا موضوعی پیمانہ (SUBJECTIVE CRITERION) بہت سے معاملات کو مشتبہ کر سکتا ہے - اور کسی قانون کی بنیاد نہیں بن سکتا -

سوئم : بیع کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں : "کچھ واضح الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ معاملہ بیع میں تاجر اپنے اصل سرمایے پر خریدارسے جو زائد مال لیتا ہے، یعنی مثلاً سو روپے میں خریدی ہوئی ایک سو دس میں بیچ کر جو دس روپے زائد لیتا ہے، اس زائد کے عوض چونکہ اسکی طرف سے محنت موجود ہوتی ہے، جو سب کے نزدیک پیدائش دولت کا متفقہ اور مسلمہ عامل ہے۔ لہٰذا وہ اس زائد مال کا حق دار ٹھہرتا ہے -" (ص ۳۷)

یہ بھی صحیح صورتِ حال نہیں ہے، دکان دار جو منافع لیتا ہے وہ صرف اُس کی محنت کا صلہ نہیں ہوتا بلکہ اس بات کا معاوضہ بھی ہوتا ہے کہ اُس نے اپنا سرمایہ لگایا ہوتا ہے - ورنہ ایک دکان دار اور اس کے ملازم کے معاوضوں میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے اگر دونوں ایک سا کام کریں - اس کی زیادہ واضح مثال اس دور میں مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں ہیں جو لوگوں کے سرمایہ سے چلتی ہیں اس میں کام صرف ملازمین کرتے ہیں - ان ملازمین کا کمپنی کے منافع میں حصّہ بہت معمولی ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنا سرمایہ نہیں لگایا ہوتا — اصل بات یہ ہے کہ سرمایہ پر منافع کئی عوامل کا صلہ ہے،

اس میں سرمایہ کا معاوضہ بھی شامل ہے، سرمایہ کار کی خطر انگیزی کا صلہ بھی اور اُس کی محنت و کاوش کا بدلہ بھی۔ منافع کی یہ سادہ سی تشریح کہ یہ صرف محنت کا معاوضہ ہے، بہت سے ایسے معاملات کو حرام قرار دے گی جو کہ امت کے درمیان متفق ہیں۔ دُنیا کے کسی معاشرے میں کبھی یہ بات رائج نہیں رہی کہ وہ شخص جو سرمایہ اور محنت لگاتا ہو اُس کا معاوضہ اتنا ہی ہو جتنا کہ اُس شخص کا جو صرف محنت لگاتا ہو، اگر یہ فرق معلوم ہے تو یہ فرق سرمایہ ہی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

جناب مولانا کی مذکورہ بالا تعریف سے ناجائز منافع خوری (Profiteering) کا جواز نکل آتا ہے کیونکہ وہ بھی باہم رضامندی سے ہو سکتی ہے حالانکہ ناجائز منافع خوری کو خود سرمایہ کارانہ نظام میں بھی سود سمجھا جاتا ہے۔

چہارم مزارعت کی حرمت پر دلیل یوں لاتے ہیں: "اس طرح معاملۂ مزارعت میں بھی ایک فریق یعنی مزارع حقیقی رضا و خوشی کے ساتھ نہیں بلکہ اس مجبوری کے تحت شریک ہوتا ہے کہ اس کے پاس حسبِ ضرورت اپنی زمین نہیں ہوتی۔" (ص ۴۰)

یہ بھی لازماً صحیح صورت نہیں ہے۔ اصل میں مزارع کے لئے انتخاب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی زمین خرید کر کاشت کرے۔ (اگر اُس کے پاس ذرائع ہوں) یا کسی دوسرے کی زمین مزارعت پر کاشت کرے۔ مثال کے طور پر اگر ایک ایکڑ زمین ایک لاکھ روپے میں خریدی جا سکتی ہو اور کوئی شخص ایک لاکھ روپے سے زمین خرید سکتا ہے تو پھر بھی اُس کے لئے ان دو حالتوں میں سے ایک کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے، اوّل یہ کہ وہ ایک لاکھ روپے کی زمین خرید لے اور اُس پر محنت کر کے پیداوار حاصل کرے، جس کا وہ کلی طور پر مالک ہوگا دوسرے یہ کہ وہ کوئی سرمایہ نہ لگائے اور صرف محنت کرے (کسی دوسرے کی زمین پر) اور اپنی محنت کے عوض پیداوار میں سے حصہ لے۔ پہلی صورت میں اور دوسری صورت میں جو اس کے حصہ میں فرق ہوگا وہ اصل میں فرق ہے اس کی زمین کی وجہ سے جس پر اُس نے ایک لاکھ روپے لگائے ہیں۔ اب

(بقیہ صفحہ ۴۹)